© rasailojaraid.com

کلیم اختر

فکر شاہ ولی اللہ کے شارح ــــــ پروفیسر محمد سرور مرحوم

پروفیسر محمد سرور مرحوم کے آبا و اجداد ریاست جموں و کشمیر سے تعلق رکھتے تھے جو ترکِ وطن کر کے گجرات کے ایک گاؤں سیکر والی میں آن بسے تھے۔ سرور صاحب ۱۹۰۵ء میں میاں فضل الدین کے ہاں پیدا ہوئے۔ خاندان کا ماحول دینی اور علمی تھا، کئی افراد ملازمتوں سے وابستہ تھے اور شعر و سخن اور علم و ادب سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ سرور صاحب کے ماموں میاں نور احمد مرحوم محکمہ مال سے وابستہ تھے۔ ان کے بڑے فرزند محمد ظہور احمد ناصر کا شمار گجرات کے ممتاز اہلِ علم اور اصحابِ سیاست میں ہوتا تھا۔ اس گھرانے کا تعلق تحریکِ آزادی سے بھی تھا، یہی وجہ ہے کہ پروفیسر محمد سرور نے اوائل عمر ہی میں برصغیر کی سیاسی شخصیتوں کو دیکھا اور اُن سے متاثر ہوئے۔ یہ وہ دور تھا جب برصغیر میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور سید عطاءاللہ شاہ بخاری مرحوم کی تحریریں اور تقریریں مسلمانوں کے دلوں کو گرما اور تڑپا رہی تھیں۔

سرور صاحب نے اُسی زمانے میں گجرات کے اسلامیہ ہائی سکول میں داخلہ لیا۔ اس تعلیمی ادارے کا رابطہ جامعہ ملّیہ سے تھا جو ابتدا میں مولانا محمد علی جوہر کی کوششوں سے علی گڑھ میں قائم کیا گیا تھا اور بعد ازاں دہلی منتقل ہو گیا تھا۔ سرور صاحب کے عزیزوں اور بزرگوں نے افرنگی حکومت کی ہر دور میں مخالفت کی۔ سید عطاءاللہ شاہ بخاریؒ، مولانا محمد ظہور ناصر مرحوم کو بہت عزیز جانتے تھے جو تا عمر خلافتی رہے۔ گجرات میں سرور صاحب کے اساتذہ میں مولانا نصر اللہ خاں عزیز مرحوم جیسے لوگ شامل تھے۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پنجابی زبان کے مشہور شاعر محمد شریف خاں افضل مرحوم سرور صاحب کے ماموں زاد بھائی اور ممتاز ادیب اور صحافی بشیر محمد اختر مرحوم (مدیر قندیل) ان کے بھانجے تھے۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد سرور صاحب اعلیٰ تعلیم کے لیے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں چلے گئے وہاں سے اُنھوں نے بی۔اے (آنرز) کی ڈگری حاصل کی۔ مسلم یونیورسٹی میں تاریخ اور عربی ادب اُن کے خاص مضامین تھے۔ علی گڑھ کے قیام کے دوران ان کو تحریک آزادیٔ ہند کے صفِ اوّل کے راہنماؤں کو دیکھنے اور سننے کا موقع ملا۔ وہ ابتدا ہی سے ایک ذہین و فطین طالب علم تھے۔ غور و فکر کی عادت تھی، پڑھتے زیادہ اور بولتے کم تھے۔ علی گڑھ اور دہلی کے ماحول نے اُن کی مذہبیت اور اسلامی حقیقی فکر کو جلا بخشی۔ اُن ایام میں وہ (۱۹۲۶ء ۔ ۱۹۳۰ء) مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابو الکلام آزاد سے اور ڈاکٹر ذاکر حسین سے بہت متاثر رہے۔ اُنھوں نے جامعہ ملیہ دہلی میں عربی کی تکمیل کی اور مولانا محمد سورتی مرحوم کے شاگرد رہے۔!

جامعہ ملیہ دہلی سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ جامعہ الازہر (مصر) چلے گئے اور وہاں چار سال تک زیرِ تعلیم رہے۔ جامعہ الازہر میں بقول سرور صاحب — ایک بہت بڑے عالم شیخ وجدی تھے، جنھیں "فیلسوف ازہر" کے باعزت لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ ان کی خدمت میں باقاعدگی سے حاضر ہوتے رہے۔ لیکن ان کے افکار کی تمام بلندی اور وسعت محض ازہر کی علمی چار دیواری تک محدود رہتی۔ وہ گرد و پیش کی دُنیا سے بے خبر تھے۔ اُنھیں کچھ معلوم نہ تھا کہ مشرق و مغرب میں کیا کیا طوفان اُٹھ رہے ہیں اور قوموں اور ملکوں کی سیاسی، معاشی اور علمی زندگی میں ابھی چند سالوں میں کیا کیا انقلابات ہو چکے ہیں اور کِن کِن کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ازہر کی دُنیا میں بظاہر سکون اور طمانیت نظر آتی تھی لیکن یہ سکون رُکے ہوئے پانی کا سکون تھا۔ ازہر کے نزدیک قدیم قدروں کی حفاظت اور اسلاف کی روایات کے تسلسل کا نام صحیح زندگی تھا۔ یہ تو تھا جامعہ ازہر کا ماحول، اس کے برعکس اسی مصر میں ایک ایک درس گاہ "جامعہ مصریہ" تھی جس میں فیکلٹی آف آرٹس کے پرنسپل ڈاکٹر طٰہٰ حسین

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھے ۔ ان دونوں مکاتب فکر کے تضادات کے بارے میں پروفیسر محمد سرور لکھتے ہیں ۔

— اگر ازہر قدامت کا مجسمہ تھی تو جامعہ مصریہ جدّت اور نیا پن کا مرقع ۔ ایک کی نظر صرف ماضی پر لگی ہوئی تھی اور دوسری کے نزدیک پیچھے کی طرف دیکھنا گناہ تھا ۔ اگر ازہر کے مشائخ اپنی دُنیا کی دل فریبیوں میں مگن تھے تو جامعہ مصر کے "فیلسوف" ڈاکٹر طٰہٰ حسین، نئی دُنیا بنانے میں ماضی کی پُر عقیدت و پُر عظمت روایت کو ترک کرنے کی دعوت دے رہے تھے — ازہر کا ماحول فاطمی اور ممالیک کے دَور کی یاد تازہ کرتا تھا اور جامعہ مصریہ کے اطراف و جوانب میں نکل جائیے تو لندن اور پیرس کا شبہ ہوتا تھا ۔ ازہر کے استاد قرآن و حدیث و فقہ کے احکام کی تفسیریں کرتے اور ہر "بدعت" کے سدِّ باب کے لیے قلم و زبان سے سرگرم عمل رہتے ۔ دوسری جانب جامعہ مصریہ کے پرنسپل ڈاکٹر طٰہٰ حسین تھے کہ قبل از اسلام کی ادبی تاریخ میں اُنھوں نے ایسی باتیں لکھ دیں کہ ان کی کتاب کو ضبط کر لیا گیا اور ان پر مصری قوم کے دین کو خراب کرنے کے الزام میں مقدمہ دائر ہوا ۔ بہرحال ایک طرف تو "خالص دین داری" کا عمل دخل تھا اور دوسری طرف کہنے والوں کی زبان میں "الحاد" اور "زندقہ" نے جھنڈے گاڑ رکھے تھے ۔ راقم الحروف کو اس "دین داری" کے ماحول سے بھی استفادے کا شرف حاصل ہوا اور ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے دَرسوں میں بھی بیٹھنے کا موقع مِلا — "

یہ ۱۹۲۹ء کا ذکر ہے — !

پروفیسر محمد سرور کو مصر کے قیام کے دوران قدامت اور تجدّد کے ان معرکوں کو دیکھنے کا موقع ملا اور اُنھیں یہ محسوس ہوا کہ قدیم و جدید کی اس کش مکش میں نئے خیالات و نئے رجحانات تقویت حاصل کر رہے ہیں ۔ اور بقول سرور صاحب "ایک طرف پرانی قدروں کی فرسودگی آنکھوں کو صاف نظر آتی تھی اور دوسری طرف نئی زندگی کے بادہ پیماؤں کا جو حشر ہو رہا تھا اس کو دیکھ کر بھی ڈر لگتا تھا "

مصر میں چار سال گزارنے کے بعد سرور صاحب وطن واپس آئے اور جامعہ ملیہ میں تاریخ کے استاد مقرر ہوئے ۔ ان ہی دنوں انھوں نے مولانا محمد علی جوہر کے اخبار کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیے مضامین لکھے، پھر انہی دنوں مولانا محمد علی کا لندن میں گول میز کانفرنس کے موقع پر انتقال ہوگیا اور سرور صاحب نے مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت، سیاست اور کردار پر سلسلۂ مضامین شروع کر دیا ۔

جامعہ ملیہ دہلی کے پرنسپل ڈاکٹر ذاکر حسین کی ہدایت پر وہ پنجاب اُٹھ آئے اور یہاں جامعہ ملیہ کی ایک شاخ قائم کی۔ اُسی دور میں مولانا ظفر علی خاں مرحوم کے اخبار 'زمیندار' میں افتتاحیہ نگار کی حیثیت سے وابستہ ہوگئے۔ اس دور میں ان کو پنجاب کے سیاسی مزاج کو سمجھنے میں بہت مدد ملی۔ اُس عہد میں صحافت کی دُنیا میں پروفیسر محمد سرور کا ایک خاص مقام بن گیا یعنی صحافت میں دیانت اور حق گوئی ۔

ابھی پنجاب میں چار سال ہی گزارے تھے کہ مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم نے جو اُن دنوں مکہ معظمہ میں مقیم تھے، شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین کو لکھا کہ ان کے پاس جامعہ کا کوئی استاد بھیج دیا جائے ۔ قرعہ فال سرور صاحب کے نام نکلا اور وہ ۱۹۳۸ء میں مکہ معظمہ روانہ ہوگئے اور وہاں مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے ساتھ کام شروع کر دیا ۔ انہی سے حضرت شاہ ولی اللہ کا فلسفہ پڑھا۔ معلوم نہیں کہ یہ مولانا سندھی کا اعجاز تھا یا شاہ صاحب کی کرامت کہ سرور صاحب تادمِ واپسیں شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و افکار کے اسیر رہے۔ اور ان کے فلسفہ و خیالات پر کئی بلند پایہ کتابیں تصنیف فرمائیں۔ ان کتابوں میں " ارمغانِ شاہ ولی اللہ"۔ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" قابلِ ذکر ہیں ۔ اور جب حیدر آباد میں "شاہ ولی اللہ اکادمی" قائم ہوئی تو پروفیسر محمد سرور اس ادارے کے ترجمان " الرحیم " کے ایڈیٹر بن گئے۔ اس زمانے میں انھوں نے علمی و دینی اور مذہبی و عمرانی مسائل پر نہایت اعلیٰ درجے کے مضامین تحریر کیے ۔

پروفیسر محمد سرور نے اپنی عمر عزیز کا ایک حصّہ مولانا عبید اللہ سندھی کے ساتھ بسر کیا۔ دراصل مولانا سندھی کی زندگی نے سرور صاحب کی شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کیے اور جب مکہ معظمہ سے واپس آئے تو جامعہ ملّیہ دہلی میں "بیت الحکمت" کے نام سے ادارہ قائم کیا۔ یہ ادارہ شاہ ولی اللہؒ کی تعلیمات و نظریات کے فروغ سے متعلق تھا۔ اُس زمانے میں اور بھی بہت سے اہلِ علم نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شاہ ولی اللہ کے افکار پر کام کا آغاز کیا اور اس موضوع سے متعلق متعدد کتابیں معرضِ تصنیف میں آئیں۔

مولانا عبیداللہ سندھی سے سرور صاحب کی عقیدت ان کے بلند پایہ دینی اور سیاسی مرتبے کی وجہ سے تھی۔ سرور صاحب مولانا سندھی کی ذاتی خوبیوں، ایثار، توکّل اور غیرت وحمیت سے بہت متاثر تھے۔ صحیح بات یہ ہے کہ سرور صاحب نے مولانا سندھی کی ان خوبیوں کو اپنی خوب صورت شخصیت میں جذب کر لیا تھا۔

مولانا سندھی کی زندگی اور نظریات پر سب سے مستند کتابیں پروفیسر سرور نے ہی لکھیں۔ ان میں مولانا عبیداللہ سندھی کے حالاتِ زندگی۔ تعلیمات۔ سیاسی افکار۔ ملفوظاتِ عبیداللہ سندھی قابلِ ذکر ہیں اور جیسا کہ بیان کیا گیا ہے۔ سرور صاحب کا بنیادی موضوع شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کی تبلیغ واشاعت تھا، چنانچہ اس غرض کے لیے اُنھوں نے شاہ ولی اللہؒ کی کئی کتابوں کے اُردو میں تراجم کیے۔ ان میں فیوض الحرمین، لمعات اور دوسری کتابیں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکی ہیں۔

۱۹۴۲ء میں پروفیسر محمد سرور پھر پنجاب آگئے اور لاہور کے مشہور اخبار "احسان" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے، لیکن وہ اخبار کی اُس دور کی پالیسی سے متفق نہ ہوئے اور ۱۹۴۳ء میں اس سے علیحدگی اختیار کر لی، لیکن جلد ہی "سندھ ساگر اکادمی" قائم کر لی اور تصنیف و تالیف کا کام شروع کر دیا۔ اس عرصے میں ان کے بھانجے محمد صدیق ان کے رفیقِ کار رہے اور اُنھوں نے ہی کتابیں شائع کیں جو علمی حلقوں میں مقبول ہوئیں، جس کی اصل وجہ پروفیسر محمد سرور کا اندازِ تحریر تھا۔ ان کی تحریر میں روانی اور شگفتگی تھی، جس کی وجہ سے یہ کتابیں بڑی مقبول ہوئیں۔ سرور صاحب کے اسلوب کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں علم و دانش کی روشنی سمو دیتے ہیں جس سے پڑھنے والے کو بہت کچھ ملتا ہے، خواہ وہ ان کے نظریات سے متفق نہ بھی ہو۔!

۱۹۴۴ء میں سرور صاحب کو دوبارہ جامعہ ملیہ دہلی میں بلا لیا گیا۔ اس وقت تک وہ مولانا محمد علی جوہر کے بارے میں ایک کتاب تصنیف کر چکے تھے، جس کا نام "مضامین محمد علی"۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"خطوط مولانا محمد علی" ۔ "مولانا محمد علی جوہر کا سفر یورپ" ۔ مولانا محمد علی کے کراچی کے مقدمہ بغاوت کی روداد بہت مشہور ہیں ۔ ان کی ایک دوسری کتاب "مولانا محمد علی جوہر تاریخ ساز شخصیت" ایک گراں قدر تصنیف ہے اور اُس دور کے سیاسی حالات و عوامل کی مستند تحریر!

قیامِ پاکستان کے بعد پروفیسر محمد سرور پاکستان آگئے اور لاہور میں قیام کیا ۔ اُس زمانے میں میاں افتخار الدین مرحوم نے روزنامہ "امروز" کا اجرا کیا تھا ۔ اس اخبار کی مجلس ادارت میں فیض احمد فیض، مولانا چراغ حسن حسرت کے ساتھ پروفیسر محمد سرور بھی شامل تھے ۔ لیکن کچھ عرصے بعد وہ اس اخبار سے الگ ہو گئے اور اپنا ہفت روزہ رسالہ "آفاق" کے نام سے جاری کر لیا، جس میں اُنھیں میاں محمد شفیع (م۔ش) اور علی محمد خادم کی رفاقت حاصل تھی ۔ بعدازاں ہفت روزہ "آفاق" جس نے صحافت کی دُنیا میں ایک نئی روایت قائم کی تھی، روزنامہ کر دیا گیا ۔ لیکن جب اخبار کی انتظامیہ نے پالیسی بدلی تو سرور صاحب نے نہ صرف اخبار چھوڑ دیا بلکہ لاہور سے کراچی منتقل ہو گئے ۔ یہ زمانہ پروفیسر محمد سرور کے لیے ابتلا کا زمانہ تھا لیکن اُنھوں نے صبر و تحمل، وقار و تمکنت کا ساتھ نہ چھوڑا ۔

حکومتِ پاکستان نے پروفیسر محمد سرور کو وزارت اطلاعات و نشریات میں شعبہ مطبوعات کا ڈپٹی ڈائرکٹر مقرر کر دیا ۔ اُس زمانہ ملازمت میں اُنھوں نے "پنجابی ادب" کے نام سے ایک مختصر مگر جامع کتاب لکھی ۔ یہ کتاب پنجابی ادبیات میں غالباً پہلی کتاب ہے جو ایک نئے انداز میں لکھی گئی ۔ چنانچہ پنجابی ادب کی تاریخ لکھنے والوں نے اسی انداز کو اپنایا ۔!

سرکاری ملازمت پروفیسر موصوف کی افتادِ طبع کے خلاف تھی ۔ چنانچہ اس سے علیحدگی اختیار کر لی اور پھر لاہور آگئے ۔ یہاں اس بات کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ روزنامہ "آفاق" سے علیحدگی کے بعد اُنھوں نے ایک معرکۃ الآرا مضمون "سیاسیات پنجاب کا ایک اہم کردار۔ میاں ممتاز دولتانہ" کی شخصیت و سیاست پر لکھا جو مرحوم شورش کاشمیری کے ہفت روزہ "چٹان" میں چھپا ۔ سیاسی مبصرین اور صحافیوں کا کہنا ہے کہ ایسا خوب صورت تجزیہ آج تک کسی سیاسی شخصیت پر نہیں لکھا گیا ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غمِ روزگار انھیں ایک بار پھر سرکاری ملازمت میں لے آیا۔ یہاں پنجاب میں ڈپٹی ڈائریکٹر مطبوعات مقرر ہوئے مگر یہاں پھر دل نہ جما اور ملازمت ترک کر کے ۱۹۵۹ء میں پشاور چلے گئے اور اپنے دوست ماسٹر گل خان کے اخبار "بانگِ حرم" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ "بانگِ حرم" کو انھوں نے ایک ایسا معیاری اخبار بنایا کہ پورے ملک میں اس کے اداریے اور تبصرے پڑھے جانے لگے۔ لیکن پشاور میں بھی ہمارا نامور اہلِ قلم سربرہنہ ہی رہا، یہاں سے پھر حیدر آباد کا رُخ کیا، لیکن وہاں بھی قرار نہ ملا۔ چنانچہ چند سال حیدر آباد میں گزارنے کے بعد وہ اسلام آباد چلے گئے، جہاں مرحوم ڈاکٹر فضل الرحمان کی معیت میں کام کیا اور ادارہ تحقیقات اسلامیہ کے ترجمان "فکر و نظر" کے ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔ اسی دوران ان کی علمی خدمات پر حکومتِ پاکستان کی طرف سے انھیں "تمغۂ امتیاز" سے نوازا گیا۔

پروفیسر محمد سرور ایک مضطرب روح رکھتے تھے اور ہر وقت متحرک اور سرگرمِ عمل رہتے۔ ایک مقام کو چند دن پسند کرتے، وہاں کام کرتے، چند ساتھی بناتے اور پھر نئی منزل کی تلاش میں نکل پڑتے۔

ادارہ تحقیقاتِ اسلامیہ سے لاہور آئے اور یہاں وہ "ادارہ ثقافتِ اسلامیہ" سے وابستہ ہو گئے۔ اُسی زمانے میں "ارمغانِ شاہ ولی اللہ" لکھی اور ادارے کے مجلّے "المعارف" کے مدیر بن گئے۔ سینے کی حرارت نے انھیں چین سے بیٹھنے نہ دیا، ادارے سے الگ ہو گئے اور خانہ نشین ہو کر مطالعہ کرنے لگے۔

۱۹۸۰ء میں حکومت پاکستان نے "الزکوٰۃ" کے نام سے جریدے کا اجرا کیا تو نیشنل پریس ٹرسٹ کے چیئرمین کے ایما پر اس کے ایڈیٹر ہو کر اسلام آباد چلے گئے۔ ڈھائی برس "الزکوٰۃ" کی ادارت کی بلکہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں وہ اسی رسالے سے وابستہ تھے۔

پروفیسر محمد سرور نے تمام عمر تحقیقی، علمی، دینی اور سیاسی کام کیا اور علمی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ انھوں نے جماعتِ اسلامی کے موضوع پر دو کتابیں۔ "مولانا مودودی اور تحریک اسلامی"، "تحریک اسلامی اور اسلامی دستور" لکھیں۔ جماعت اسلامی کو سمجھنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے لیے یہ کتابیں نہ صرف وطنِ عزیز میں بلکہ بیرونِ ملک میں بھی مقبول ہوئیں۔ کیوں کہ ان کا اسلوبِ بیان علمی تھا، مولویانہ، مجادلہ و مناظرہ سے یک قلم پاک صاف۔

پروفیسر محمد سرور کا استدلال یہ ہے کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی ساری تحریک مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی تحریک الہلال کا پرتو ہے اور جو کچھ ابوالکلام الہلال اور البلاغ میں کہہ چکے تھے، مولانا مودودی نے اُنہی باتوں کو سلیس زبان میں دُہرایا اور مولانا آزاد کی تحریک کو آگے بڑھایا ہے۔

یہاں یہ ذکر بے جا نہ ہوگا کہ سرور صاحب کی ان کتابوں سے بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوئی کہ پروفیسر محمد سرور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کے خلاف ہیں۔ چنانچہ جب سابق صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں اور مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح مرحومہ کا انتخابی مرحلہ آیا تو ایک اعلیٰ سرکاری آفیسر نے پروفیسر صاحب سے رابطہ قائم کیا اور کہا آپ مولانا مودودی کے خلاف لکھیے۔ حکومت آپ کو معقول معاوضہ دے گی۔ اس پر پروفیسر صاحب نے اُس اعلیٰ آفیسر کو جواب دیا کہ آپ پہلے یہ بتلائیے کہ آپ کو یہ کس نے کہا ہے کہ میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے خلاف ہوں۔؟ میں تو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی علمی شخصیت کا معترف ہوں۔ اس پر اس اعلیٰ افیسر نے جماعت اسلامی سے متعلق سرور صاحب کی کتابوں کا حوالہ دیا — تو اس پر پروفیسر محمد سرور نے کہا آپ پہلے وہ کتابیں پڑھیں۔ ان میں تو تحریک اسلامی کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے تاریخی اور مذہبی تجزیہ کیا گیا ہے، نیز یہ کہ میں یہ "دھندا" بھی نہیں کرتا جو آپ مجھ سے کرانے آئے ہیں، کہا جاتا ہے کہ ان کی ادارہ تحقیقات اسلامیہ (اسلام آباد) سے علیحدگی کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔

پروفیسر محمد سرور نے زندگی بھر رزقِ حلال کمایا اور کبھی اپنے قلم کو کسی کے ہاتھ نہیں بیچا۔ ان کے نظریات کا سرچشمہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے نظریات اور مولانا عبیداللہ سندھی کے افکار ہیں۔ جہاں مولانا عبیداللہ سندھی اور علامہ اقبال کے افکار و نظریات میں یگانگت ہے، وہاں فکرِ اقبال کے خوشہ چیں تھے۔ پروفیسر سرور ایک کھلا ذہن رکھنے والے دانش مند تھے اور اجتہاد کے قائل اور تجدید کے حامی تھے۔ ان کا دل ایک سچے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسلمان کا دل تھا، جس میں رواداری، اخلاص، مخلوقِ خدا سے ہمدردی کا جذبہ بدرجہ اتم موجود تھا۔

بے شبہ پروفیسر محمد سرور کا شمار اُن ادیبوں، قلم کاروں اور مفکروں میں ہوتا ہے جو اسلام کی آفاقی قدروں کے ترجمان ہیں۔ اُنھوں نے ۲۲ ستمبر ۱۹۸۳ء کو وفات پائی۔ پروفیسر موصوف نہ صرف اسلامی قدروں کے ان تھک مبلغ تھے، بلکہ ان کی چلتی پھرتی عملی تصویر بھی تھے۔ موجودہ وقت پر جب کہ پُرانے سانچے ٹوٹ رہے ہیں اور اخلاقی قدریں توڑ پھوڑ کا شکار ہو رہی ہیں، پروفیسر محمد سرور کی یاد بہت تڑپاتی ہے۔

© rasailojaraid.com